ہمارا اخلاقی وجود اور اس کی اہمیت

By Rehan Ahmed Yusufi

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اپنے ساتھ کسی قسم کا اخلاقی وجود لے کر نہیں آتا۔ اس کے اخلاقی وجود کی تشکیل ان افعال و اعمال سے ہوتی ہے جن کا ظہور دنیا میں آنے کے بعد اس کی ذات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اخلاقی وجود پر کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے یہ بہتر ہو گا کہ ہم اس کی تشکیل میں کارفرما عوامل کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان اسباب و محرکات کو معلوم کریں جو انسانی افعال و اعمال کے پس پشت کام کرتے ہیں۔ ان بنیادوں کو متعین کریں جن کے اوپر وہ اپنی عملی زندگی کے گھروندے کی تعمیر کرتا ہے۔ انسانی عمل کے یہ محرکات مندرجہ ذیل ہیں۔

انسان کے عمل کا پہلا اور سب سے قوی محرک ضرورت ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کے ساتھ کچھ لازمی ضروریات لگی ہوئی ہیں جن کو پورا کیے بغیر وہ جی نہیں سکتا۔ انسان کو بھوک لگتی ہے۔ وہ پیاس محسوس کرتا ہے۔ اسے ایک چھت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنے وجود کے تسلسل کے لیے وہ اولاد کا محتاج ہے۔ یہ اور اس جیسی دیگر کئی ضروریات ہیں جن کی عدم تکمیل اس کی بقا کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ انسان ان کی تکمیل کے لیے تگ و دو شروع کر دیتا ہے۔ اور اسی تگ و دو سے حیات انسانی کا سب سے ضخیم باب تشکیل پاتا ہے۔ بھوک کو ہی لے لیجیے۔ زمانہ قبل از تاریخ میں شکار کے پیچھے بھاگنے سے لے کر آج دفتروں میں بیٹھ کر فائلوں کی ورق گردانی کرنے تک انسان نے جو کچھ کیا ہے، اس کے پیچھے یہی ضرورت کارفرما رہی ہے جس کی تسکین اس کے وجود کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ بلکہ کارل مارکس نے تو معاش کو بنیاد بنا کر انسانی تاریخ کو متعین کرنے کی کوشش تک کر ڈالی ہے۔

انسان کی سعی و کاوش کا یہ سلسلہ ضروریات کی تکمیل پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان میں خواہشات کا ایک ایسا تلاطم بھی برپا رہتا ہے جو اسے خوب سے خوب تر کی جستجو پر مجبور رکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی ضرورت پوری ہونے پر ہی قانع نہیں رہتا، بلکہ خواہش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر طریقے پر اسے اپنی مراد حاصل ہو۔ یہی خواہشات کی وہ زنجیر ہے جو اس حیوان ناطق کو کشاں کشاں جھونپڑی سے محل اور گھر کے سکون سے تخت شاہی کے ہنگاموں تک ہنکاتی ہوئی لے جاتی ہے اور دال سبزی سے پیٹ کی آگ بجھانے والا انسان لذت کام و دہن کا ایک ایسا خوان نعمت سجاتا ہے جس کی وسعت سات سمندر سے زیادہ ہے۔

ضروریات و خواہشات کے یہ محرکات اس کے میدان عمل کی حد بندی کا آخری نشان نہیں، بلکہ جذبات و احساسات کی رنگین اور جادوئی دنیا بھی انسان کی توانائیوں کو دعوت عمل دیتی ہے۔ انسان کو غصہ آتا ہے۔ بالکل ایسے ہی اسے پیار بھی آتا ہے۔ وہ عہد و وفا کی پاس داری کرتا ہے اور دوستی اور محبت کے تقاضوں کو بھی نبھاتا ہے۔ وہ بغض و حسد کی آگ میں جلتا ہے اور نفرت و عداوت

کے صحرا میں بھی جھلستا ہے۔ وہ عقیدت کی شمع جلاتا ہے اور اطاعت کے پھول بھی نچھاور کرتا ہے۔ وہ سرکشی کا لاوہ اگلتا ہے اور بغاوت کی آندھی بھی اٹھاتا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کے جذبات اسے اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں وہ اپنی جان دے دیتا ہے اور دوسروں کی جان لے بھی لیتا ہے۔

اصولی طور پر انسانی عمل کو مہمیز لگانے والے عناصر کی کہانی یہیں ختم ہو جانی چاہیے، مگر انسانی جذبوں میں ہی ایک جذبہ ایسا بھی ہے جو اپنی اہمیت، انسانی شخصیت میں اپنی گہری اساسات اور عملی زندگی میں اپنے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے بالکل منفرد حیثیت کا حامل ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا ذکر الگ کیا جائے۔ یہ جذبۂ شہوت یا جنس کا جذبہ ہے۔ جنس کا جذبہ انسانی اعمال اور رویوں پر کس طرح اثرانداز ہوتا ہے، اگر اسے دیکھنا ہے تو مثال کے طور پر کسی مخلوط تعلیمی ادارے میں چلے جایئے۔ یہی جذبہ اشتہار کی صنعت میں خواتین کے بے جا استعمال کی واحد توجیہ ہے۔ انسان آج ہی ایسا نہیں ہوا۔ انسان کی مجموعی تاریخ میں اس کے اثرات دیکھنے ہوں تو ادب اور آرٹ کی تاریخ ملاحظہ کر لیجیے۔ فنون لطیفہ کی داستان پڑھ لیجیے۔ مصوری و مجسمہ سازی، شعر و شاعری، فلم و موسیقی غرض کسی بھی شعبے میں ہونے والے کام کو دیکھ لیجیے۔ آپ جان لیں گے کہ انسان کے اعصاب پر کس طرح یہ جذبہ سوار رہا ہے۔ فرائڈ نے جو کچھ کہا اس سے کلی اتفاق تو نہیں کیا جا سکتا، مگر اس کی کلی تردید بھی ممکن نہیں۔

ضروریات، خواہشات، جذبات اور شہوات کے یہ چار بنیادی محرکات ہیں جو انسانی عمل کی اساس ہیں اور جن کی بنیاد پر انسان اپنی دنیا آباد کرتا ہے۔ تاہم اس مرحلے پر ایک اور اہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ خود یہ محرکات کہاں سے آتے ہیں؟ ان کا منبع اور سرچشمہ کہاں ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں اور ان عناصر کو دریافت کریں جن سے مل کر ایک انسانی وجود تشکیل پاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم قرآن مجید سے مدد لیتے ہیں۔ سورۂ سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے عمل کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"وہی ہے جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی اور انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے ست سے چلایا۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے کان، آنکھ اور دل بنائے۔ تم کم ہی شکر کرتے ہو۔" (۳۲: ۷۔۹)

یہ اور اس موضوع سے متعلق دیگر آیات بتاتی ہیں کہ انسانی وجود کی تخلیق میں تین عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اس کا حیوانی وجود، دوسرا روحانی اور تیسرا اس کا عقلی وجود۔ اس کا حیوانی وجود دیگر جان داروں کی طرح مادی عناصر کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے۔ تمام حیوانی جبلتیں اور نظام اس کے وجود کا اسی طرح حصہ ہیں جس طرح دوسرے حیوانات کا حصہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تخلیق آدم سے لے کر آج تک ہر انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا کل سرمایہ صرف ایک

حیوانی وجود نہیں ہوتا، بلکہ وہ خدا کی طرف سے پھونکی گئی ایک اور شے بھی لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اس پھونک کی حقیقت کو تو ہم متعین نہیں کر سکتے، البتہ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ اس پھونک کے باعث انسان اپنے اندر ایک روحانی شعور اور شخصیت محسوس کرتا ہے جس کا ادراک حیوانی جسم رکھنے والا کوئی دوسرا جانور نہیں کر سکتا۔ حیوانی اور روحانی وجود، دونوں مل کر انسان کی بنیادی شخصیت کی صورت گری کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ جو تیسری چیز انسان کو عطا کی گئی ہے، وہ سوچنے سمجھنے، غور و فکر اور عقل و بصیرت کی وہ استعداد ہے، جسے قرآن اکثر کان، آنکھ اور دل کے اسلوب سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی انسان کا عقلی وجود ہے۔

انسانی شخصیت انھی تین رنگوں سے مرکب ہے۔ اور اس دنیا میں جب کبھی وہ اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے تو انھی تین پہلوؤں میں سے کسی ایک یا ان تینوں کے مجموعے کا کوئی عکس صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتا ہے۔ انسان کی شخصیت کے یہی پہلو ہیں جن سے وہ محرکات پھوٹتے ہیں جن کا کچھ تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ چنانچہ بھوک اس لیے ہے کہ انسان کے حیوانی وجود کا یہ تقاضا ہے۔ اسے اپنی بقا کے لیے خوراک چاہیے۔ پھر انسان اس کے لیے معاش کی جدوجہد کرتا ہے۔ اس کا روحانی وجود مادی تقاضوں سے بلند ہو کر کچھ دوسری حقیقتوں کا متلاشی رہتا ہے۔ یہ تلاش اس کے روحانی وجود کا لازمی تقاضا ہے۔ جس کے نتیجے میں مذہبیت کا پورا کارخانہ وجود میں آتا ہے۔ انسان کو قلب و نظر دیے گئے ہیں جن کی مدد سے وہ چیزوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ علم، فکر اور فن کی دنیا وجود پاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں، وہ اصلاً انسان کی اس سہ جہتی شخصیت کے اثرات ہیں جو زمین کے ہر اس خطے پر نقش ہیں جہاں اس کا قدم پہنچا۔

انسان کی تخلیق کردہ یہی سہ رنگی دنیا جو مذکورہ بالا محرکات کی چار دیواری میں قائم ہے، انسان کے اخلاقی وجود کی دنیا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جہاں انسان اپنا اظہار کرتا ہے اور یہی وہ دنیا ہے جس کی نوعیت کل قیامت کے دن یہ فیصلہ کرے گی کہ یہ انسان خدا کی رحمت کا مستحق ہے یا غضب کا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی حیوانی، روحانی اور عقلی شخصیت کو اپنے ہاتھوں سے وجود دینے کے بعد رب کائنات کیا اس کی اخلاقی دنیا سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے؟ حالانکہ یہی وہ دنیا ہے جہاں وہ انسان کا امتحان لیتا ہے۔ کیا اس معاملے میں انسان کو کوئی رہنمائی دی گئی ہے جس کی بنیاد پر انسان کا امتحان ہو گا یا اسے ضروریات، خواہشات، جذبات اور شہوات کے اندھے کنوئیں میں بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا ہے؟ کیا حیوانی اور روحانی وجود میں توازن کی کوئی راہ نہیں دکھائی گئی ہے؟ کیا انسان کے قواے عقلیہ کو کوئی رہنما اصول نہیں دیے گئے ہیں؟ کیا انسان کو بے آسرا کر کے اس کے ماحول کے حوالے کر دیا گیا ہے؟ کیا اس کی باگ وراثت کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی ہے کہ جہاں چاہے بگٹٹ اسے دوڑاتی پھرے؟ کیا انسان کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ کیا نیکی ہے اور کیا بدی؟ کیا خیر ہے اور کیا شر؟ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟

قرآن اس سوال کا جواب بڑے واضح انداز میں یہ دیتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو بھیجتے وقت جس طرح اسے ایک مکمل حیوانی اور روحانی وجود دیا گیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں زادِ راہ کے طور پر اس کے ہم رکاب کی گئی ہیں، اسی طرح انسان اس دنیا میں خیر و شر کے مکمل شعور کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ وہ اس مادی دنیا میں اجنبی ضرور ہوتا ہے، مگر اخلاقیات کی دنیا کا کوئی گلی کوچہ اس کے لیے اجنبی نہیں ہوتا۔ یہ شعور اس درجہ کا ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کی رہنمائی نہ ہو تب بھی اسی کی بنیاد پر قیامت کے دن انسان کی فلاح یا ہلاکت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

"قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدی اور تقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے گھٹیا بنایا۔" (سورۂ شمس ۹۱ : ۷۔۱۰)

اسی طرح سورۂ بلد (۹۰) کی آیت ۱۰ میں باصراحت کہا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو (خیر و شر) دونوں راہیں دکھا دیں۔

انسانی فطرت میں یہ اساسات اتنی واضح اور راسخ ہیں کہ انسانی تاریخ میں کبھی یہ حادثہ نہیں ہوا کہ خیر شر بن گیا اور شر خیر قرار پایا ہو۔ انسان انفرادی طور پر فطرت کی اس پکار پر کان دھرے نہ دھرے، لیکن انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے افراد کے عملی انحراف کو کبھی معیار نہیں بنایا۔ جھوٹ اور سچ میں سے کون سی راہ درست ہے، مرد کے لیے انتخاب ایک عورت ہے یا ایک دوسرا مرد، انسانی جان کا احترام لازمی ہے یا نہیں، کمزور اور ضعیف رحم کے مستحق ہیں یا نہیں، بول براز کی نجاست اور درندوں کا گوشت وغیرہ دستر خوان پر سجانے کی چیزیں ہیں یا نہیں؟ یہ اور ان جیسے کتنے ہی امور ہیں جن میں انسان عملی طور پر ٹھوکر کھا جاتا ہے، مگر وہ یہ نہ جان سکے کہ کیا راستہ درست ہے اور کیا غلط ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ بہر حال ہوا ہے کہ وقتی طور پر بعض معاشروں میں انسانی فطرت مسخ ہوئی اور فطرت سے انحراف معاشرے کا عرف بن گیا، مگر جیسا کہ ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ خدا نے فوراً مداخلت کی اور ایسی قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور پوری انسانیت فطرت کی پگ ڈنڈی پر پہلے کی طرح چلتی رہی۔ اور آج کے دن تک ان قوموں کے رویے کو بگاڑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ بات بالکل واضح رہنی چاہیے کہ خیر و شر انسانی فطرت کے وہ بدیہیات ہیں جن کے تعین میں انسان کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا۔ حتیٰ کہ ہم وحی کی جس ہدایت سے واقف ہیں، اس کی اپنی اساس یہی دین فطرت ہے۔ نبی اور رسول بھی جب آتے ہیں تو اپنی دعوت کی اساس اسی کو بناتے ہیں۔ وہ خود بھی اسی اساس پر کھڑے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کی کوئی علمی شرط ہمارے علم میں نہیں، لیکن ہم یہ بات باوثوق طریقے سے جانتے ہیں کہ وہ نخل فطرت کا اعلیٰ ترین ثمر ہوتے ہیں۔ ان کے دشمن بھی ان کی اخلاقی حیثیت کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ جب میں بندوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولتا تو خدا کے معاملے میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ میں جب انسانوں کے معاملے میں امین ہوں تو خدا کے معاملے میں خیانت کیوں کروں گا؟ وہ جب دعوت حق پیش کرتے ہیں تو

انسانی فطرت کے ان بدیہیات کو اپنی دعوت کی اساس بناتے ہیں۔ وہ ایمان واخلاق کی درستی سے آغاز کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اسی کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ اس معاملے میں اگر کوئی انحراف ہوتا ہے تو اس کو درست کرتے ہیں، کوئی اختلاف ہوتا ہے تو اسے دور کرتے ہیں، کوئی چیز کم ہو جاتی ہے تو اسے بحال کرتے ہیں اور کچھ زیادتی ہو تو اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی شریعت پیش کرتے ہیں، وہ اس کے بعد آتی ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ قرآن جب نازل ہوا تو ابتدا میں کون سی سورتیں نازل ہوئیں۔ ان تمام سورتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاًان میں فطرت میں موجود اخلاق وایمان کے تصور کو دعوت کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ دین فطرت سے جو کچھ رہنمائی انسان کو ملتی ہے، تمام مسلمہ اخلاقی اقدار اس میں شامل تو ہیں، لیکن اخلاقیات کے علاوہ بھی دین فطرت سے انسانوں کو بہت کچھ رہنمائی ملتی ہے۔ مگر وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے ہم ان کی تفصیل میں نہیں جا رہے۔ دوسرے یہ کہ ایمانیات میں سے توحید اصلاً اسی اخلاقی رہنمائی کا حصہ ہے جو ہمیں دین فطرت سے ملتی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اخلاقیات کا تذکرہ ہے، اس کے ساتھ اکثر توحید کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۲۲ تا ۳۹ ہیں۔ اس کے علاوہ البقرہ (۲) کی آیت ۸۳ اور النساء (۴) کی آیت ۳۶ اور قرآن کے کئی دیگر مقامات بھی اس حوالے سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ان آیات میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ توحید اخلاقیات کا رکن اول ہے۔ یہ تمام خیر کا سرچشمہ اور دوسری اخلاقیات کی طرح فطرت انسانی میں پیوست علم ہے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۷۲۔ ۱۷۴ میں عہد الست کے حوالے سے باصراحت اس بات کا ذکر ہے کہ توحید کا علم انسانیت کے لیے اجنبی چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے وجود کے بارے میں کبھی انسانیت کو کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور نہ ہی خدا اپنے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ البتہ چونکہ شیطان کو آزادی ہے کہ وہ لوگوں کو بہکائے، اس لیے وہ انہیں شرک کے بگاڑ میں مبتلا کرتا رہا ہے۔ اور انبیائے اکرام اسی بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کا اخلاقی وجود محض علمی نوعیت کی کوئی چیز نہیں جس پر فلسفیانہ انداز میں بحث وتمحیص کے بعد یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ یہ وہ پرچۂ امتحان ہے جس کی بنیاد پر کل خداوند دو عالم انسانوں کے اعمال کو جانچے گا اور ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اور جن قوموں میں نبیوں کی دعوت محفوظ نہیں رہی، وہاں تو نجات کی واحد کسوٹی یہی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس پرچہ کے صحیح جوابات کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔ جیسا کہ اوپر ہم نے بتایا ہے کہ اس سلسلے کا ایک بندوبست تو یہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت خوشبو اور بدبو کی طرح خیر وشر کے امتیاز میں کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ دوسری طرف انبیا کے ذریعے سے انسانی فطرت میں پیدا ہونے والے انحرافات کی بار بار تصحیح کی جاتی رہی ہے اور تیسری طرف جب کبھی شیاطین جن وانس کی دراندازی کے نتیجے میں کسی انسانی

معاشرے میں فطرت کے معیارات ہی بدلنے لگے تو ایسی صورت میں اس پورے معاشرے کو ایک ناسور کی طرح انسانی وجود سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ تاریخ انسانی میں یہ واقعہ اتنا معروف ہے کہ فلسفۂ تاریخ کے بانی ابن خلدون نے اس بات کو قوموں کے عروج و زوال کے ایک مسلمہ اصول کے طور پر بیان کیا ہے کہ اخلاق حمیدہ کے زوال کے ساتھ قوم کا زوال لازمی ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ جب کوئی قوم اخلاقی انحطاط کا شکار ہونے لگے تو اصلاح احوال کی کوشش کرنے والے ہر شخص کو اپنی ترجیحات میں اسے سب سے اوپر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس بات کا براہ راست تعلق قوم کی بقا سے ہوتا ہے۔ اخلاقی بحران کا شکار قوم اگر مسلمان ہے تو معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ حامل کتاب ہونے کی بنا پر ان کے پاس اس انحراف کا کوئی عذر نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل اور مسلمان، دونوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب کبھی انھوں نے انحراف کی روش اختیار کی قدرت نے غیر معمولی مستعدی کے ساتھ ان کی سرزنش کی۔ بنی اسرائیل پر بخت نصر کی یورش سے لے کر مسلمانوں پر موجودہ مغربی غلبہ تک، ہر واقعہ گو عالم اسباب میں پیش آیا، مگر اس کی جڑیں اس اخلاقی انحطاط تک جاتی ہیں جس میں مبتلا ہونے کے بعد وہ حامل کتاب ہونے کی ذمہ داری ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔

آج بحیثیت ایک پاکستانی مسلمان کے ہمارے لیے کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اپنے اخلاقی وجود کی اہمیت کو محسوس کریں اور اخلاقی اقدار کو اپنی ذاتی زندگی اور معاشرے میں بحال کرنے کے لیے پوری قوت سے کوشش کریں۔ وہ اقدار جو دین فطرت اور دین وحی، دونوں کی بنیاد پر ہمیں ملی ہیں، مگر بد قسمتی سے ہم نے انھیں پس پشت ڈال دیا ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ڈر ہے ۔ کہ کہیں قدرت ہماری بھی سرزنش پر اسی طرح آمادہ نہ ہو جائے جو اس سے پہلے مسلمان قوموں کے ساتھ اس کا دستور رہا ہے

ریحان احمد یوسفی

۔۔۔ تو پھر کیوں نہ

ہمارے ہاں اکثر لوگ تمام غیر مسلموں کو کافر کہتے ہیں اور انھیں جہنمی قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی جنگ یا لڑائی میں مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم مارے جائیں تو وہ بلا توقف کہہ دیتے ہیں کہ اتنے "۔۔۔ "جہنم واصل۔

پچھلے دنوں ایک رسالے میں تین "کافروں "اور ایک مسلمان حکمران کے بارے میں فیچر شائع ہوا۔ ان میں دو مرد اور دو عورتیں شامل ہیں۔ رسالے کے مطابق ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے سے ان لوگوں کی زندگی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی۔ ہم نے یہ فیچر اس پہلو سے دیکھا کہ یہ چاروں افراد اپنی زندگی کے اہم معاملات کے لیے رہنمائی کہاں سے لیتے ہیں۔

اس فیچر میں ایک "کافر" نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ میں بہت زیادہ مذہبی آدمی نہیں ہوں، البتہ میں دو چیزوں کے حصول کے لیے دعا کرتا ہوں: ایک وہ بصیرت جو مجھے سیدھی راہ دکھائے اور دوسرے وہ جرأت جو مجھے اس راہ پر چلائے۔

دوسری "کافرہ" نے کہا کہ میں ہر رات دوزانو ہو کر دعائیں مانگتی ہوں۔ میں ہر وقت چھوٹی چھوٹی دعائیں کرتی رہتی ہوں۔ میری دعائیں خصوصی نہیں، عمومی ہوتی ہیں۔ میری ایک پسندیدہ دعا یہ ہے: (اے خدا،) میں تیرے پسندیدہ راستے پر چلوں، نہ کہ اپنے پسندیدہ راستے پر۔

تیسری "کافرہ" کا شوہر ۱۱ ستمبر کو جنگل میں گر کر تباہ ہونے والے جہاز میں سوار تھا۔ خبروں کے مطابق اس کے شوہر نے مسافروں کو اس بات پر ابھارا تھا کہ جہاز اغوا کرنے والوں کے ساتھ لڑا جائے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ اس طرح اس سمیت سب مسافروں کی موت واقع ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس عمارت میں موجود لوگوں کو بچانا چاہتا تھا، جہاں یہ جہاز ٹکرایا جانے والا تھا۔ چنانچہ جہاز میں لڑائی شروع ہوئی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاز اپنے ہدف تک پہنچنے سے پہلے ہی گر کر تباہ ہو گیا اور اس میں سوار تمام افراد جاں بحق ہو گئے۔

اس "کافرہ" کے تین بچے یتیم ہو گئے۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ اس کا والد بھی اس وقت فوت ہو گیا تھا جب وہ صرف ۱۵ سال کی تھی۔ اس نے سخت اضطراب میں وہ حادثہ یہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا کہ خدا نے کسی حکمت کی خاطر ہی انھیں موت دی ہو گی۔ اس نے کہا کہ والد کی موت نے مجھے اب یہ بات سمجھنے میں مدد دی ہے کہ میرے شوہر کی بے وقت موت کے پیچھے بھی خدا کی کوئی حکمت کارفرما ہو گی، جو خدا ہی کے علم میں ہے۔۔۔ جو ابھی تک میرے اوپر واضح نہیں ہو سکی۔

اس فیچر میں مسلمان حکمران کے حوالے سے بتایا گیا کہ اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ اس پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہے۔ وہ نپولین اور نیکسن کی قائدانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہے۔ وہ نیکسن کی ایک کتاب کو بہت پسند کرتا ہے۔ اپنے اس انٹرویو میں وہ نیکسن کے اقوال کا حوالہ بار بار دیتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے فیصلے کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے نپولین کا ایک نقطۂ نظر سامنے رکھا تھا۔

ان "کافروں" کی دعائیں پڑھنے کے بعد ہمیں اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی بہترین دعا یاد آ گئی، وہ دعا جو سارے دین کی حامل ہے، وہ دعا جو صحیح دین داری کی غماز ہے، وہ دعا جو قرآن کا دیباچہ ہے، وہ دعا جو انسانی فطرت کی آواز ہے، وہ دعا جو انسان کے عجز کا اقرار ہے، وہ دعا جو بندگی کا اظہار ہے، وہ دعا جو سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف ہے۔ اور اس دعا کے الفاظ گواہی دیتے ہیں کہ انھیں ادا کرنے والا مذہبی جذبے سے سرشار ہے، وہ خدا کا سچا شکر گزار ہے اور وہ خدا کے سامنے کامل سپردگی کا طلب گار ہے :

:سورۂ فاتحہ میں ہے

(۵۔ ۶ :۱) ۔ اِھۡدِنَاالصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ

" ۔ ہم کو سیدھی راہ کی ہدایت بخش دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تونے عنایت فرمائی ہے"

یہ صراط مستقیم کیا ہے ؟ صراط مستقیم پر چلنے والے کون لوگ ہیں ؟

۔ سورۂ نساء کی آیت ۶۹ سے بالکل واضح ہے کہ ان سے مراد انبیاو صدیقین اور شہداو صالحین کی مقدس جماعت ہے

؟ سوال یہ ہے کہ اس مقدس جماعت کا تاریخی ریکارڈ کس کے پاس ہے

یہ ریکارڈ ہم مسلمانوں کے پاس ہے۔ جی ہاں، صرف ہم مسلمانوں کے پاس، جزئیات کی حد تک اور محفوظ ترین۔

لہٰذا ہمیں غور کرنا چاہیے کہ جب "کافروں" کے ہاں صراط مستقیم کی خواہش پائی جاتی ہے، جب "کافروں" کے ہاں رضائے الٰہی کی سعی پائی جاتی ہے، جب "کافروں" کے ہاں راضی برضا کی روش پائی جاتی ہے تو پھر کیوں نہ ہم انھیں نفرت سے دیکھنے کے بجائے، انھیں قتل کرنے کے بجائے، انھیں "جہنم واصل" کرنے کے بجائے دین کی تعلیم دیں، صحیح زندگی کا شعور دیں، انھیں ۔ جنتی بنائیں۔ جو یقیناً بہتر کام ہے، بلکہ بہترین کام ہے

محمد بلال

بدلتی کیفیات

عقل نگاہ سے کام لے کر مشاہدہ کرتی ہے۔ اس مشاہدے کو ترتیب دے کر سلسلۂ خیالات بناتی ہے۔ موضوع و محمول، صغریٰ و کبریٰ اور فرع و اصل کے تانے بانے سے ایک نتیجے کو پالیتی ہے۔ اگر نگاہ بیدار ہو، عقل حاضر ہو تو یہ سلسلہ اپنی کڑیاں مکمل کرکے صحیح نتیجے تک پہنچتا ہے اور اگر نگاہ کوتاہ ہو، عقل خفتہ ہو تو کیسی منطق اور کیسی رسائی؟ آدمی وہم و تردد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک بات سوچتا ہے اور اسے اس پر یقین نہیں ہوتا۔ دوسری بات سوچتا ہے تو بھی کسی نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ اس بدلتی کیفیت کو انسان کی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دل کبھی نشاط سے لبریز ہوتا ہے اور کبھی پژمردہ۔ جسم کسل مند (Faculties) دوسری صلاحیتوں ہوتا ہے اور چست بھی۔ کان تیز ہوتے ہیں اور ثقیل بھی۔ یہ کمزوری اور فترت جو گاہے گاہے ہوتی ہے، عمر گزارنے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دانا و بینا انسان جو اپنے زمانۂ کمال میں کئی کارنامے دکھا چکا ہوتا ہے، زوال پزیر ہو جاتا ہے۔ اس کی بینائی اور

سماعت کام نہیں کرتیں، اعضاسست پڑ جاتے ہیں اور اس کی کارکردگی اور استعداد ماند پڑ جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اس کی ساخت ہی کو ہم الٹ دیتے ہیں۔ کیا یہ حالت دیکھ کر بھی انھیں عقل نہیں آتی؟ اور تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے جو ناکارہ عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ جان لینے کے بعد کچھ نہ جانتا ہو۔

جسمانی عمر بڑھنے کے ساتھ اعضاے جسم کا زوال پزیر ہونا ہی اس دنیا کے فانی ہونے کی نشانی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انسان بلوغت، عقل کی پختگی اور نت نئے تجربات حاصل کر لینے کے بعد کچھ عرصہ جی لیتا۔ لیکن افسوس، اسے طرح طرح کے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں۔ عقل مضمحل ہو جاتی ہے۔ قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں۔ موت سامنے نظر آنے لگتی ہے اور وہ اگلے جہاں کو کوچ کر جاتا ہے۔

اسے دنیا کا بڑا المیہ کہا جا سکتا تھا، اگر دنیوی زندگی کے بعد حیات اخروی نہ ہوتی۔ وہ حیات، جہاں عارضوں اور نارسائیوں کا دخل نہ ہوگا۔ کمزوریوں اور کوتاہیوں کو در آنے کی اجازت نہ ہوگی۔ لیکن اس زندگی کو حاصل کرنے والے کون ہوں گے؟ وہ جنھوں نے اس زوال آمادہ زندگی میں کچھ کیا ہوگا۔ دیے کی ٹمٹماہٹ اور ستاروں کی جھلملاہٹ کو غنیمت جان کر روشنی حاصل کی ہوگی۔

ضعف اور کسل مندی کے باوجود اس رنج دہ زندگی میں کچھ کر لینا چاہیے، کیونکہ بعد میں یہ موقع نہ مل پائے گا۔ یہ بدلتی کیفیات اور یہ اتار چڑھاؤ جاری رہیں گے۔ اگر ہم نے تھوڑا سا عمل بھی کر لیا تو گویا اپنا حصہ وصول کر لیا۔ وہ حصہ جو ہمارا توشہ بنے گا۔ اگر کم تر سطح پر جیے تو ہمیشہ کا زوال یقینی ہے اور اگر ذرا اوپر والی سطح پر رہنے کی کوشش کی تو کمال ملنے کا کافی امکان ہے۔

ڈاکٹر وسیم اختر مفتی